تعارفِ کتب

عبد الحمید صدیقی

(چند سال پیشتر ترجمان القرآن میں تعارفِ کتب کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ کو بعض احباب نے پسند فرمایا۔ لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ جاری نہ رکھا جا سکا۔ اب اسے از سرِ نو شروع کیا جا رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ کسی افادیت کا حامل ہو۔)

THE NEW HOPES FOR THE CHANGING WORLD.
بدلتے ہوئے عالم کے لیے نئی توقعات

تالیف برٹنڈرسل BERTRAND RUSSEL

رسل کے علمی مرتبہ سے دنیا کا ہر لکھا پڑھا شخص واقف ہے۔ اُن کی فلسفیانہ تصنیفات علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ چند سال پیشتر انہیں علمی دنیا کے سب سے بڑے اعزاز یعنی نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ صاحبِ موصوف کے اندازِ فکر میں تدریجاً ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی جاتی ہے۔ اُن کی اولین تالیفات میں "ذہنی بازیگری" زیادہ تھی۔ وہ اس دنیا کی نہیں بلکہ کسی دوسری دنیا کی باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ بڑھاپا اُن پر پوری طرح مسلط ہو گیا ہے تو انہوں نے اس عالمِ فانی کی حقیقتوں کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ اس لیے اُن کے افکار میں اب "ارضیت" نسبتاً زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب اُن کی وہ ریڈیائی تقریریں ہیں جو انہوں نے "سالماتی عہد کی زندگی" کے عنوان سے نشر کی تھیں۔ اس کتاب کے تین حصص ہیں جنہیں بارہ ابواب پر پھیلایا گیا ہے۔

ہر وہ شخص جس نے حیاتِ انسانی کا ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ ہر انسان اس زندگی میں تین مختلف محاذوں پر لڑ رہا ہے۔ ایک طرف وہ قدرت اور اُس کی جبریت و قہرمانیت کے خلاف صف آرا ہے اور پیہم کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح وہ اس کے بندھنوں سے آزاد ہو۔ اُس کی ساری تاریخ اسی کوشش کی طویل مگر دلچسپ داستان ہے۔ دوسری طرف وہ اپنی نوع کے افراد کے خلاف جنگ آزما ہے اور تیسرے اُس کا اپنا وجود بھی ایک رزم گاہ بنی ہوئی ہے۔ اس کے اپنے احساسات و جذبات، اور افکار و نظریات آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ پہلی لڑائی کے لیے اسلحہ سائنس مہیا کرتی ہے، دوسری

کے لیے سیاست و معیشت اور تنبیری کے لیے مذہب اور نفسیات۔ انسانیت کے بقا اور نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس "سہ ملکھی کشمکش" کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرے اور اب نئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ان تین مختلف میدانوں میں اترے۔ اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہوگئی تو وہ زندہ رہ سکے گی ورنہ وہ خود بخود نیست و نابود ہو جائیگی۔

سب سے پہلے رسل عہد حاضر کی پیچیدگیوں کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے کھینچتا ہے۔ آپ ذرا اسے ملاحظہ فرمائیں

"ہم اپنے آپ کو ایک ایسی جنگ کی طرف ناگزیر طور پر بڑھتے ہوئے پاتے ہیں جس کے متعلق ہم سے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ہمیں تباہ و برباد کر دیگی۔ لیکن ہماری حالت اس خرگوش کی سی ہے جسے سانپ نے مسحور کر رکھا ہو۔ وہ خطرے کو بھانپتا تو ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ اس سے کس طرح بچا جائے۔ ہم ایک دوسرے کو سالماتی اور ہائڈروجن بموں کی خوفناک کہانیاں سناتے ہیں، ہم جگہ جگہ اجڑے ہوئے شہروں، روسی حملوں، قحط اور ظلم و تعدی کے تذکرے کرتے ہیں۔ ہماری عقل ان ہلاکت خیزیوں کے نام سے بھی کانپ اٹھتی ہے لیکن اسی عقل کا ایک شعبہ ایسا بھی ہے جو ان میں لذت محسوس کرتا ہے اس لیے ہم میں وہ مضبوط قوت ارادی پیدا نہیں ہونے پاتی جس سے کام لے کر ہم اس بدنصیبی سے نجات حاصل کریں۔ ہماری روح دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ عقلمندانہ ہے اور دوسرا غیر عاقلانہ۔ جب حالات معمول پر ہوں تو غیر عاقلانہ حصہ دن بھر سوتا ہے اور صرف رات کو بیدار ہوتا ہے لیکن اس وقت جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں یہ غیر عاقلانہ حصہ دن کے وقت بھی اکثر حملہ آور ہوتا رہتا ہے اور ہماری فکری صلاحیتوں کو مضمحل کر دیتا ہے۔ ہماری زندگی مفروضات کی نہایت ہی نازک سرحدوں پر کھڑی ہے ..... اکثریت کے لیے یہ طرز حیات از حد تکلیف دہ ہے۔ ایک نوجوان جو تعلیم سے اکتا گیا ہے اپنے آپ کو یہ کہکر تسلی دیتا ہے "گھبرانے کی کیا بات ہے زندگی کا جلد ہی کسی میدان جنگ میں خاتمہ ہو جائے گا" وہ خاتون جو اپنی تعمیری قوتوں کو بروئے کار لاکر بہتر کام سرانجام دے سکتی ہے یہ سوچتی ہے کہ کیوں نہ عیش کی جائے پیشتر اس کے کہ روسی سپاہ اس پر مجرمانہ حملہ کر کے اُس کو موت کے گھاٹ اُتار دے۔ والدین اس سوچ میں ڈوبے

ہوئے ہیں کہ کیا وہ ساری قربانیاں جو وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے کر رہے ہیں وہ اُکارت تو نہیں جائیں گی۔ وہ لوگ جن کے پاس سرمایہ ہے وہ اسے عیش و عشرت پر لگا رہے ہیں کیونکہ وہ اپنے سامنے اپنا انجام بد دیکھ رہے ہیں۔"

زندگی کا یہ طرزِ فکر نہایت ہی غلط اور غیر صحتمندانہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان پر کبھی کبھی حالات کی ناسازگاری کو دیکھ کر یاس و قنوطیت کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ اور وہ زندگی کے ہنگاموں سے مُنہ موڑ کر کچھ دیر کے لیے حیرت زدہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے لیکن یہ اُس شخص کی مستقل کیفیت نہیں ہوتی۔ یہ حالت محض عارضی ہے جو کچھ دیر کے بعد یقین و عمل سے بدل جاتی ہے۔ دورِ جدید کی مایوسی اس قسم کی دل شکستگی نہیں بلکہ یہ بے یقینی ہے۔ ایک ایسی بے یقینی جو موت کا پیغام ہے، جو نہ صرف انسان کی فکر و عمل کی صلاحیتوں کو یکسر مفلوج کر دیتی ہے بلکہ بسا اوقات خودکشی پر منتج ہوتی ہے۔ اس سے ہر ہوشمند انسان کو بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بقول رسل "دورِ جدید کی قومیں گرفتارِ بلا ہیں۔ ان کے ذہنی افق پر گہرا دھندلکا چھا رہا ہے وہ تباہی کے عمیق غاروں کی طرف بڑی سرعت سے بڑھ رہی ہیں اور گمان یہ کرتی ہیں کہ وہ اس کو دور چھوڑ رہی ہیں۔"

جن لوگوں پر "بے یقینی" غالب نہیں وہ بدقسمتی سے ایسے نظریات کو اپنا چکے ہیں جو انسانیت کے لیے سخت مہلک ہیں۔ مثال کے طور پر یہ عقیدہ کہ دنیا میں حکمرانی اور فرمانروائی کا حق صرف گورے اور خصوصاً آرین نسل کے لوگوں کو ہے، کسی طرح بھی دنیا میں امن و امان کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ رسل اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہماری زندگی کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ وہ لوگ جو یقین کی نعمت سے مالا مال ہیں، وہ عقل و خرد سے محروم ہیں اور جو لوگ کچھ بھی غور و فکر کی قوتیں رکھتے ہیں اُن کے دل و دماغ پر شکوک و شبہات کا قبضہ ہے۔"

اس ابتدائی گفتگو کے بعد فاضل مصنف اصل کشمکش کی طرف آتا ہے۔ اس سلسلہ میں اُس نے سب سے پہلے تسخیرِ فطرت کا ذکر کیا ہے۔ انسان نے آج تک ایجادات و انکشافات میں جو حیرت انگیز

ترقی کی ہے، اُس کی داستان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے انسانیت کی راہ میں کچھ "سنگ گراں" ڈال رکھے ہیں۔ ان کی غرض و غایت یہ نہیں کہ انسان کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے بلکہ ان کا مقصد انسانیت کو دعوت فکر و عمل دینا ہے تاکہ وہ اپنے دل و دماغ کی قوتوں سے کام لے کر انہیں اپنے راستے سے ہٹا دے۔ یہ زمان و مکان کی حدبندیاں جنہوں نے انسانی زندگی کو مجبور اور بوجھل بنا دیا ہے یہی دراصل انسان کی ترقی و ارتقا کی ضامن ہیں۔ انہیں پر عبور حاصل کرنے کے لیے انسان نے جدوجہد شروع کی اور اس کے نتیجے میں اسے فطرت کے لاتعداد راز ہائے سربستہ معلوم ہوئے۔ یہ سبک رفتار سواریاں اور ہوا کے تموج کو نامہ و پیغام کا ایلچی بنانے کے جو مختلف طریقے وضع کیے گئے یہ سب انہیں رکاوٹوں کے چیلنج کا کامیاب جواب ہیں۔ ہمیں اس حصہ سے کافی حد تک اتفاق ہے۔ لیکن جہاں سے ایک مسلمان کا راستہ جدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تسخیر فطرت کو ایک انسان اپنی حماقت سے تسخیر خدا سمجھ لے۔ قدرت کے یہ مختلف مظاہر بھی خالقِ کائنات کی اُسی طرح مخلوق ہیں جس طرح انسان۔ اُن کو اپنے قابو میں لیکر ان سے فائدے اٹھانے کو جو لوگ خدا پر انسان کی فتح خیال کرتے ہیں، اُن کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان مظاہر کے بارے میں غور و فکر کا فطری نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ آدمی ان کے بنانے والے، ان کے انتظام و انصرام کرنے والے کی عظمت کا اندازہ لگائے لیکن اگر کوئی ان پر غور کر کے ان کے خالق کے وجود سے ہی انکار کر دیتا ہے تو اسے اس کی کج فہمی کے علاوہ اور کس چیز پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

پھر اس قسم کے لوگوں کی ایک اور منطق بڑی دلچسپ ہے۔ یہ حضرات یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جو چیز اُن کی عقل کی زد میں آجائے وہ خود بخود معدوم ہو جاتی ہے گویا کسی چیز کا اُن کی عقل کی گرفت میں آنا ہی اُن کے وجود کی نفی کر دیتا ہے۔ یہ لوگ ذات باری تعالیٰ کو ایک طلسم ہوشربا خیال کرتے ہیں کہ جب تک وہ ان لوگوں کی خرد کی جست سے باہر رہے تو اُس کا وجود یقینی ہے لیکن جب اُن کی عقل اس کی گرہیں کھول دینے میں کامیاب ہو جائے تو اُس کا وجود بھی تحلیل ہو جاتا ہے چنانچہ ان لوگوں نے خدا کے متعلق جو غور و فکر کیا ہے اُس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان جب اس عجائب خانہ قدرت میں لایا گیا تو وہ مبہوت ہو کر بہت سی چیزوں کو خدا سمجھ بیٹھا۔ پھر اُس کی عقل نے جُوں جُوں قدرت کے ان عجائبات کو سمجھنا شروع کیا تو خداؤں کی تعداد بھی گھٹتی چلی گئی اور بالآخر وہ ایک خدا کو ماننے لگا اور اب جب انسان نے قدرت کو پوری طرح سمجھ لیا ہے تو خدا کا وجود بھی عنقا ہو گیا ہے۔ رسل کی اس بحث میں ایک عجیب و غریب تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اس بات

کا قائل ہے کہ انسانی زندگی کی خوشحالی تسخیرِ فطرت سے وابستہ ہے مگر دوسری طرف وہ اس بات کا رونا روتا ہے کہ غربی اقوام مشرقی اقوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے جو کوششیں کر رہی ہیں وہ اُن کی سرعت سے بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے یکسر ضائع جا رہی ہیں۔ یہ طرزِ استدلال رسل کے اپنے خیال سے بھی متصادم ہے، کیا آبادی کا روکنا انسان کی فطرت کے سامنے شکست کی علامت ہے یا فتح کا نشان؟ یہ تو اعلانِ بیچارگی اور معذوری ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان فطرت کے حملوں کی تاب نہ لاکر خود اپنے گھر والوں پر ہی حملہ آور ہو گیا ہے تاکہ انہیں فطرت کے ہاتھوں قتل کرا دینے کی بجائے اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔ پھر رسل صاحب کو اس معاملہ پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا مغرب کی امداد فی الواقع ہماری ہی بہتری اور بھلائی کے لیے کی جاتی ہے یا اس کے پسِ پردہ کچھ استعماری عزائم بھی کام کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ ایشیائی ممالک کو اقتصادی امداد دے رہا ہے۔ لیکن اس امداد کا بیشتر حصہ ان ممالک کو فوج منظم کرنے پر مجبوراً صرف کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے اس "سخاوت" کو اس طریق سے مختلف ممالک میں خرچ کروایا جاتا ہے جس سے غیر ملکی استعمار کے ہاتھ مضبوط ہوں۔

انسان اور انسان کے تصادم کے تحت رسل قومیت پرستی کی مذمت کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ جذبہ انسانیت کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اب جبکہ پوری دنیا کے دور دراز گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب آگئے ہیں۔ ان حالات میں یہ سمجھنا کہ جارحانہ قوم پرستی کا نظریہ اپنا کر کوئی قوم دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے، سخت بیوقوفی ہے۔ اب ہمیں اپنے فکر و نظر کو بدلنا چاہیے اور اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ انسانیت کو قومی اور نسلی تعصبات کی تاریکیوں سے نکال کر ایک ایسے مقام پر لے آئیں، جہاں وہ انسانیت کے نقطۂ نظر سے غور کر سکے۔